ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

علامہ شبلی کی فارسی غزل

پنجابی کے ایک مشہور صوفی شاعر کا مصرع ہے:

دل دریا سمندروں ڈونگا ، تے کون دِلاں دیاں جانے ہُو

(دل ایک ایسا دریا ہے جو سمندر سے بھی زیادہ گہرا ہے، دلوں میں جو کچھ سمایا ہوا ہے، اس کی کسی کو کیا خبر)

یہ دل کہ بیک وقت غم و آلام کی آماجگاہ بھی ہے اور عشق و محبت کا گہوارہ بھی، جو سوز و درد کی جائے پناہ ہے اور کیف و سرمستی کا چشمہ بھی، جس میں ایک جہانِ جذبات و احساسات آباد ہے، کون اس کی اتھاہ گہرائیوں کو پا سکتا ہے۔ اسی دل نے عشق و محبت میں فنا ہو کر حیاتِ جاوید حاصل کی اور اسی دل، اِسی ظالم دل نے اچھے بھلے زاہدوں اور پرہیزگاروں کو کچھ اس قدر ورغلایا کہ بیچارے ''پیرانہ سالی'' میں ''غم خردسالاں'' میں الجھ کر اور یوں چشم عزیزاں میں خوار ہو کر رہ گئے[۱]۔

شبلی مرحوم جیسے بلند پایہ عالم بھی اس دل ستم پیشہ کی دست درازیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس نے ان سے ایسے ایسے شعر کہلوائے کہ ان کے حوالے سے علامہ کی ''حیاتِ معاشقہ'' کی ایک پوری داستان مرتب ہو کر کتابی صورت میں چھپ گئی۔

مولانا شبلی ایک زبردست مذہبی و دینی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ دل بھی تھے، نرے دقیانوسی اور خشک قسم کے زاہد نہ تھے اور بقول شیخ محمد اکرام:

> اگر وہ اپنے عہد شباب میں ایک طرف تارکینِ صلوٰۃ کو نماز نہ پڑھنے پر دو دو گھنٹے تک پیٹا کرتے تھے تو دوسری طرف شہر میں جو مشاعرے ہوتے تھے، ان کے میر مجلس بنتے اور گرم گرم عاشقانہ اشعار لکھتے[۲]۔

مولانا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے میرزا احسان احمد رقم طراز ہیں:

> حُسن و عشق کی اخلاقی اور روحانی عظمت، بلندی اور پاکیزگی کا احساس جو ایک باکمال غزل گو شاعر کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور مقدم شرط ہے، اس کا اثر علامہ مرحوم کے مذاق تغزل میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے[۳]۔

شبلی مرحوم کی غزلیات کے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کلام اُس شبلی کا نہیں ہے جنہوں نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' اور ''الفاروق ؓ'' جیسی بلند پایہ مذہبی کتب لکھیں، بلکہ کسی ایسے شبلی کا ہے جو ایک رندِ

سرمست ہے، جس میں بے پناہ جوش و مستی ہے اور جو مے و معشوقِ مجازی کا بے طرح والہ و شیدا ہے۔ ان کی کوئی غزل اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں تقریباً ہر شعر اپنے اندر ایک جہانِ کیف و مستی اور رندی و سرشاری لیے ہوئے ہوگا اور خصوصاً وہ غزلیں جو انہوں نے ''دیارِ حبیب، بمبئی'' میں بیٹھ کر لکھی ہیں وہ حافظ شیرازی کے کلام سے ٹکر کھاتی ہیں۔ بمبئی (بھارت کا مشہور شہر) کا ذکر انہوں نے مختلف مواقع پر نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے۔ مثلاً

نثارِ بمبئی کُن ہر متاعِ کُہنہ و نو را
طراز مسندِ جمشید و فرِّ تاجِ خسرو را
شبلی عناں گسستہ مرو سوئے بمبئی
مانیز با تو ہم سفریم ، این شتاب چیست
ز ذوق طبع شبلی من در اوّل روز دانستم
کہ در آشوب گاہِ بمبئی در بازد ایماں را

اس مختصر سے مضمون میں چونکہ مولانا شبلی مرحوم کی غزلیات سے صرف فنّی اور تنقیدی لحاظ سے بحث کرنا مقصود ہے اس لیے، طوالت سے اجتناب کی خاطر، ان کے مختلف اشعار کے پس منظر کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔ اس ضمن میں محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی تصنیف ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' کی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سلاست و روانی اور سادگی مگر پُر کاری علامہ شبلی کی غزلیات کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ انہوں نے ''سبک ہندی'' کے مقلدوں کی مانند پیچ در پیچ مضامین اور دور از کار تشبیہات و استعارات میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی شاعری دل کی شاعری ہے۔ جو بھی کیفیت ان کے دل پر گزرتی ہے، وہ اپنے زُہد و وَرع کا خیال کیے بغیر، اس کا اظہار برملا اور سیدھے سادے مگر دل نشیں انداز میں کر دیتے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں:

چند در پردہ توان کرد سخن ، فاش بگوی
سنگ بر شیشۂ تقویٰ زدہ ام ، ہاں زدہ ام

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

شبلی ہر آنچہ داشت بہ دل ، بر زباں فگند
گویا کہ کار با صنمِ ثند خُو نماند

ہمارے بیشتر شعرا اوّل تو وَصلِ محبوب سے محروم ہی رہتے ہیں اور جو خوش بختی سے کہیں وصل نصیب ہو بھی گیا تو وہ بیچارے خود اس قدر بے ہوش یا حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ انہیں نہ تو آغازِ وصل ہی کا پتا چلتا ہے اور نہ انجام ہی کا، لیکن ہمارے شاعر کو جب اپنے ''ماہِ تمام'' کی خلوت گاہ میں بار حاصل ہوتا ہے تو وہ ان تمام نعمت ہائے غیر مترقبہ سے، جو معدودے چند کو میسر آتی ہیں، پورے طور پر متمتع ہوتا ہے:

کس چہ داند کہ بخلوت گہ آں ماہِ تمام
زدہ ام ساغر و بر یادِ حریفاں زدہ ام

جاے آنست کہ گلشن دمد از کنجِ لَبَم
بوسہ ہا بسکہ برآں عارضِ خنداں زدہ ام
صد چمن لالہ وگل جوشدم از جیب وبغل
قرعۂ فالِ ہم آغوشیِ جاناں زدہ ام
صد دکاں لعل و گہر چیدہ ام از گفتارش
طعنہ بر بے سرو سامانیِ عمّاں زدہ ام
بوسہ ہا بر لبِ نوشیں زدہ ام از پیہم
طوطیِ گرسنہ ام ، بر شکر ستاں زدہ ام

یا مثلاً

من فداے بُت شو خے کہ بہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
سنبلستاں می دمدا ز جیب و آغوشم ہنوز
زلفِ مُشکیں در برم روزے پریشاں کردہ بود[۴]

اور اگر کبھی ایسے مواقع پر محبوب پر حیا طاری ہو جاتی ہے تو وہ بڑے ملتجیانہ انداز میں اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا ہے:

شب وصل است حیا گر بگذاری چہ شود
یک دمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
تو بدیں حُسنِ توانگر چہ زیاں برداری
ایں دو سہ بوسہ اگر خود نہ شماری ، چہ شود
از تو ناید گرہِ بندِ قبا وا کردن
اگر ایں عقدہ بہ من باز سپاری ، چہ شود
بوسہ ہا بر لبِ نوشینِ تو وام است مرا
وامِ من ہم بمن ار باز سپاری چہ شود

محبوب سے دوری بھی کیا بُری شے ہے کہ ایک اچھا بھلا انسان بھی پاگلوں اور دیوانوں جیسی حرکات کرنے لگتا ہے۔ علامہ نے اس مضمون کو جس طریقے سے ادا کیا ہے، یہ اُنھی کا حصہ ہے:

بے حاصلی نگر کہ بہ ایں دوری از رُخش
صد جاے بہرِ بوسہ نشاں کردہ ایم ما

علامہ شبلی کے کلام میں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، یاس و نا امیدی اور غم واندوہ کے برعکس کیف و مستی اور سرور وانبساط کا عنصر زیادہ ہے۔ ہجر وفراق کی تلخیوں کا ذکر ان کی غزلیات میں بہت کم ہے۔ کوئی غزل لے

لیجیے، یہی معلوم ہوگا، جیسے ایک رندِ لاابالی بادۂ وصل سے سرشار و سرمست ہو کر نغمہ ہائے نشاط الاپ رہا ہے۔ وصل کے متعلق چند اور شعر ملاحظہ ہوں:

گویَا دشمن ہم از ذوقش نصیبے بردہ است
بادۂ وصلش چشیدم ، از مذاق افتادہ بود

کس اچھوتے پن سے رقیب کی دست درازی اور محبوب کی جا و بیجا سپردگی کو ظاہر کیا ہے۔ بادۂ وصل کا چکھنا اور اسے ذائقہ سے گرا ہوا پانا، ان تراکیب نے شعر میں ایک حُسن پیدا کر دیا ہے:

آغوشِ شوق و دیدۂ گستاخ و دستِ شوخ
در وصل ہر چہ بود زِ من خود بکار بود
از بس کہ شُد بود ، مے خوشگوارِ وصل
مستی بروں ز حوصلۂ اختیار بود
شب وصلے و شغلے ایں چنیں صدرہ نصیم باد
کہ تو بندِ قبا را عقدہ بر لبستی و وا کردم

علامہ ایک دل شیدا رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے دل کے بہلاوے یا اسے قربان کرنے کے لیے ''لالہ رخ'' درکار ہیں اور ایسے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض اوقات برسوں کا حاصل کردہ مایۂ تقویٰ و پرہیز گاری بھی لٹانا پڑ جاتا ہے، کیا کیا جائے، آخر ''دل ہی تو ہے۰۰۰۰'':

من کہ در سینہ دلے دارم و شیدا، چہ کنم
میل با لالہ رخاں گرنکنم تا چہ کنم
من نہ آنم کہ بہر شیوہ دل از دست دہم
لیک با آں نگہِ حوصلہ فرسا، چہ کنم
ہست چل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمش
گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقویٰ ، چہ کنم
ساغر بادہ و طرفِ چمن و لالہ رُخے
چوں بہ اینہا فتدم کار، بفرما چہ کنم
دل متاعے ست گراں مایہ بہ کس نتواں داد
رایگاں گر برد آں ترک بہ یغما ، چہ کنم

مندرجہ ذیل شعر کس قدر حقیقت کا رنگ لیے ہوئے ہے:

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی
ورنہ عمرے ہر دو را باہم نفاق افتادہ بود

علامہ کے نزدیک اس ہاتھ سے بیکار تر دنیا کی اور کوئی شے نہیں ہے، جو ہاتھ کہ حلقۂ طوق کمر میں نہیں

ہے اور زندگی کا لطف جبھی ہے کہ اس میں ذوقِ نگاہ اور ہنگامۂ عشق ہو:

بیکار تر از او نبود در حلقۂ عالم
آں دست کہ در حلقۂ طوق کمرے نیست
نے ذوق نگاہے و نہ ہنگامہ عشقے
اے وائے نہ شہرے کہ در و فتنہ گرے نیست

شعر ذیل میں رمزیت، جو غزل کی جان ہے، پورے طور پر کارفرما ہے:

دل از خوباں گرفتی خوب کردی
و لیکن ذوق و عرفاں را زیاں کرد

کس لطیف پیرائے میں حسینوں سے دل پھیر لینے کو بُرا ثابت کیا ہے؛ کہتے ہیں:
اگر محبوب کے ہونٹ ایمان کو تازگی بخشنے والے نہ ہوتے تو اس کی کافر آنکھیں خرمنِ ایمان کو جلا چکی ہوتیں:

لعل معجز کیشِ او طرحِ مسلمانی نہاد
ورنہ چشمش رخنہ ہا درکارِ ایماں کردہ بود

محبوب کے ظلم و جور پر دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ وہ ابھی بچہ ہے۔ اس کا یہ جور و ستم کسی جفا کے باعث نہیں، بلکہ محض نادانی کی بنا پر ہے:

از بس کہ طفل بودہ و کار آشنا نبود
جورے کہ کردہ است بہ طورِ جفا نبود

شبلی مرحوم نے زُہاد و واعظین کی ریاکاری کو بھی مختلف طریقوں سے فاش کیا ہے، جس طرح غالب نے واعظ کی مے نوشی کا یقین دلانے کے لیے پہلے خود کو میخوار ثابت کیا ہے:

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب، اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اسی طور علامہ نے بھی ان مذہب کے اجارہ داروں کی قلعی کھولی ہے۔ فرماتے ہیں:

از ما بگیر درس فنونِ ریا کہ ما
عمرے دراز زاہد و مستور بودہ ایم
سبحہ اے داشتم از جملۂ اسباب ورع
رفت ازیادم و در خانۂ خمّار بماند
این نمی دانم کہ گبرم ، یا مسلماں نیستم
ایں قدر دانم کہ زاہد آنچہ ہست آں نیستم

من نیز ہمچو شیخ دم از زہد می زنم
اوّل مرا بہ بادہ دَمے آزموں کنید

اس آخری شعر میں کتنا لطیف طنز ہے۔ یعنی یہ زُہد وتقویٰ اتنی ہی دیر تک ہے جب تک مے ارغواں کا دور نہیں چلتا۔

ضایع مساز خرقۂ مستوری مرا
وقتے رسد کہ باز بہ برمی کنیم ما

ذیل کا شعر تو قتیل کے شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے:

مولانا کے مطابق:

راہے دگر بغیرِ حریم ، حرم نداشت
زاہد کہ تابِ جلوۂ روے صنم نداشت

اور بقول قتیل:

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں
کنجے گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت

اگرچہ شبلی مرحوم کا کلام سراسر بادۂ انگور کی مستی اور جوش لیے ہوئے ہے، لیکن کہیں کہیں صہبائے تصوف کے چھینٹے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، یہ ان کے اپنے علم وفضل کے باعث ہو، لیکن ان کے بقیہ کلام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بظاہر ایسے اشعار میں جذبے کا خلوص نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اشعار انھوں نے یا تو بادۂ مجاز کی تلخی وتندی کم کرنے کے لیے کہے ہیں یا پھر ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' پر عمل کیا ہے۔ صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں:

برقِ عشقے کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود
ایں ہمان است کہ بر وادی ایمن زدہ بود
چشمم ہر آنچہ دید نہ ہر دیدہ بنگرد
نظارۂ جمال تو عام است و عام نیست
ہر جا کہ روے روشنِ تو جلوہ ساز بود
ہر ذرّہ را نظر بہ جمالِ تو باز بود

مختصر یہ کہ علامہ چونکہ ایک بہت بڑے نقادِ سخن تھے، اس لیے انھوں نے شاعری کرتے وقت ہر قسم کے فنی معایب سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے۔ انہوں نے موزونیِ الفاظ، بندش کی چُستی اور ترکیبوں کی لطافت اور اسی طرح کے دوسرے محاسن کا خاص خیال رکھا ہے، جس سے ان کے فارسی کلام میں ایک خاص قسم کی برجستگی اور روانی آ گئی ہے، جو فنِ شعر گوئی میں ان کی پختگی کی دلیل ہے۔

حواشی

۱۔ فیضی کہتا ہے:

بچشم عزیزاں مرا خوار دارد
بہ پیرانہ سالی غمِ خُرد سالاں

اس ضمن میں شیخ صنعان کا بھی واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے جو اپنی تمام تر عبادت و زہد کے باوصف ایک حسینہ کے عشق میں گرفتار ہو کر دین سے منحرف ہو گئے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد واپس آ گئے۔

۲۔ ''شبلی نامہ''، ص ۱۴۵۔

۳۔ ماہنامہ ''معارف (اعظم گڑھ) مارچ ۱۹۴۹ء

۴۔ عمادِ فقیہ کرمانی کا شعر یاد آ گیا: اگرچہ اس نے ذرا دوسرے انداز میں بات کی ہے، تاہم ہے بوے یار ہی سے متعلق:

ازیں دیار گذشتی و سالہا بگذشت
ہنوز بوے تو می آید از منازل ما